پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اکرم

مولانا رومی اور احیائے ملت اسلامیہ

ساتویں صدی ہجری جس میں مولانا رومی نے ۶۰۴ھ سے ۶۷۲ھ تک زندگی بسر کی ، ملت اسلامیہ کے فکری اور سیاسی انحطاط اور سقوط کا بدترین زمانہ تھا ۔ فکری انحطاط فلسفہ اور تصوف کے بعض لایعنی نظریات اور منفی رجحانات کی وجہ سے پیدا ہوا جن کی بنیادیں تقریباً تیسری صدی ہجری سے رکھی جا چکی تھیں ۔ اسلامی فتوحات کا دائرہ جب روم اور ایران کی سرحدوں سے آگے بڑھا تو مسیحی ، زرتشتی اور ہندی ادیان کے آثار اور خصوصاً یونانی افکار مختلف طریق سے بعض مسلمانوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہوئے اور مرور زمان کے ساتھ ساتھ اسلامی فکر کا جزو تصور ہونے لگے ۔ ذات ، صفات ، کائنات ، اتحاد ، حلول ، فنا ، تقدیر ، وحدت الوجود وغیرہ جیسے مباحث اور عقائد مختلف مآخذ کے ذریعے شائع ہوئے جن کی مبہم تعبیرات کے نتیجے میں بہت سے مسلمان اپنی انفرادی حیثیت سے گریزاں ہونے لگے ۔ انہی عقائد نے شیوۂ جبر و تسلیم کو بھی لوگوں میں رواج دیا ۔ توکل ، صبر ، رضا ، قناعت اور انکساری کی توجیہات غیر قرآنی نقطۂ نظر سے کی گئیں ۔ چنانچہ فنا کو آئینہ بقا اور عدم کو اصل وجود گردانا گیا ۔ بیخودی خدا شناسی کا ذریعہ اور نیستی ہستی کا سرچشمہ قرار پائی ۔

آہستہ آہستہ ان فکری رجحانات اور سیاسی انتشارات نے مسلمانوں میں قوت عمل کو سلب اور ان کی انفرادی اور اجتماعی حیثیت کو ان کی نظروں میں مشکوک قرار دے دیا ۔ اس طرح ملت اسلامی ایک پیکر بے روح کی طرح بن گئی ۔ ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں عالم اسلام پر منگولوں کے خوفناک اور انتہائی وحشیانہ حملے

شروع ہوئے ۔ یہ دور تاریخ اسلام کا سیاہ ترین دور تھا جس میں ہر طرف قتل و غارت ، تباہی و بربادی ، خوف و ہراس اور یاس و حزن کی فضا چھائی ہوئی تھی ۔

منگولوں کے پے درپے حملوں نے نہایت بے دردی سے ہر خاص و عام کو تہ تیغ اور شہروں کو نذر آتش اور برباد کر دیا ۔ صرف شہر مرو میں لاکھوں مرد ، عورتیں ، بچے اور بوڑھے قتل ہوئے ۔ نیشاپور کا قتل عام زیادہ خوفناک تھا ۔ اس کے لئے چنگیز کا حکم تھا کہ یہاں کتوں اور بلیوں کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے اور شہر کو اس طرح مسمار کر دیا جائے کہ اس پر زراعت ہو سکے ۔ خوارزم اور غزنہ کو بھی اسی طرح ویران کر دیا گیا ۔ ترکستان ، ماوراء النہر اور خراسان کے تمام شہروں اور قصبوں پر بے دریغ تلوار چلائی گئی ۔ یہ حملے اتنے خوفناک تھے کہ لوگ انہیں مشیت الٰہی تصور کرتے ہوئے خود بخود تلواروں کے سامنے جھک جاتے اور زبونی و زاری کی وجہ سے اپنا دفاع تک نہ کرتے ۔ تباہی و بربادی کا یہ خوفناک طوفان بڑھتا چلا گیا ۔ یہاں تک کہ ٦٥٦ ہجری میں ہلاکو نے مسلمانوں کی طاقت اور تہذیب کے اہم ترین مرکز بغداد کو بھی نیست و نابود اور وہاں علوم و فنون کے تمام مکاتب و مدارس کو نذر آتش کر دیا ۔

ان خون آشام اور وحشت انگیز حملوں کا بدترین پہلو مسلمانوں کا فکری انحطاط اور ذہنی انتشار تھا ۔ لوگوں میں اس بے سر و سامانی اور یاس و پریشانی کے بعد قومی شعور اور دینی حمیت کا کوئی ولولہ جو بقائے ملی کے لئے ضروری ہوتا ہے باقی نہ رہا ۔

مولانا جلال الدین اس دور میں ایشیائے کوچک کے شہر قونیہ میں مقیم تھے ۔ یہ علاقہ منگولوں کے مسلمان حکمرانوں کے زیر نگیں تھا ۔ مولانا کے ملفوظات بعنوان ''فیہ مافیہ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مسلمانوں کے اس دینی ، اخلاقی ، تمدنی اور سیاسی زوال سے سخت پریشان تھے ۔ مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کو ایک شخص کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ :

"اس زمانے میں مسلمان منگولوں کے آگے سجدۂ تعظیم بجا لاتے ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔"

حملۂ منگول کے ساتھ ساتھ صلیبی جنگوں نے بھی عالم اسلام کو بہت عرصہ پہلے سے مصائب و مشکلات سے دوچار کر رکھا تھا۔ چوتھی صلیبی جنگ ۶۰۲ ہجری میں شروع ہوئی تھی اور فرنگی قسطنطنیہ پر قابض ہوگئے تھے۔ پانچویں جنگ ۶۱۵ ہجری میں شروع ہوئی اور چھٹی جنگ ۶۲۴ ہجری میں سسلی کے حاکم فریڈرک نے شروع کی جس کے نتیجے میں فلسطین کے بیشتر علاقے عیسائیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ اس وقت عیسائیوں نے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے طرح طرح کی سازشیں شروع کیں۔ انہوں نے منگولوں کے ساتھ رشتے ناطے شروع کئے۔ چنانچہ ہلاکو کی بیوی عیسائی تھی اور وہ خود بدھ مت کا پیرو تھا۔ اس کا جانشین اباقا بھی بدھ مت کا پیرو تھا اور ایک باپ کی طرح سے عیسائیوں کی مدد کرتا تھا۔[۲]

اباقا کے دور میں عیسائیوں کو خاص تقویت حاصل ہوئی۔ اس کی بھی ایک بیوی مشرقی روم کے بادشاہ (ملک استنبول) کی بیٹی تھی[۳]۔ مولانا نے "فیہ مافیہ" میں عیسائیوں اور منگولوں کی اس سازش کو ایک شخص اتابک کے حوالے سے اس طرح بیان کیا ہے:

"ایک دن روم کے کافر یعنی عیسائی کہہ رہے تھے کہ ہم بیٹی تاتاریوں کو دیں گے تاکہ ہمارا اور ان کا دین ایک ہو جائے اور یہ نیا مذہب جسے اسلام کہتے ہیں مٹ جائے۔"[۴]

مولانا کے ایسے اشعار کفار کی انہی سازشوں کی طرف اشارات ہیں۔ فرماتے ہیں:

دشمن جان ہائے ماست دوستیٔ دوستاں
مادرِ فتنہ شد است حاملہ یا مسلمیں[۵]

ایک دفعہ معین الدین پروانہ کو جو منگولوں کی طرف سے قونیہ کا حاکم اور مولانا کا ارادت مند تھا مولانا نے مسلمانوں کے اجتماعی معاملات اور مفادات سے

کوتاہی کرنے کے سبب متنبہ کیا اور فرمایا :

"تو تاتاریوں میں گھل مل گیا ہے ، تو انہیں مدد دے رہا ہے تاکہ شامیوں اور مصریوں کو فنا کر دے اور مملکتِ اسلام کو تہس نہس کر دے۔"[٦]

سقوط بغداد کے بعد مسلمان مادی اور معنوی شکست اور انحطاط کی وجہ سے بالکل مضمحل ہو چکے تھے ۔ چنانچہ اکثر و بیشتر بے سر و سامان ہو کر اپنی نا امیدیوں اور نا مرادیوں کو ساتھ لے کر خانقاہوں اور میخانوں کے گوشوں میں پناہ گزین ہوگئے ۔ عرصۂ کوشش و کار میں کوئی انسان ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا ۔ رومی اس قحط الرجال کے عالم پر متاسف اور اس زوال یافتہ ماحول سے سخت متنفر تھا ۔ توکل اور تقدیر کا بہانہ بنا کر عمل سے جی چرانے والے لوگ اسے کسی صورت بھی پسند نہ تھے ۔ وہ اپنے کاہل الوجود اور سست عناصر ہمراہیوں سے بیحد بیزار تھا اور معاشرے میں علی مرتضیٰ شیر خدا جیسے قوی اور شجاع مجاہدوں اور رستم دستان جیسے بہادر شمشیر زنوں کو دیکھنا چاہتا تھا ۔ وہ ایسے جسور و غیور انسان کی تلاش میں تھا جو معنوی صلاحیتوں کا مظہر اور مادی قوتوں کا پیکر ہو ۔ رومی اپنی اس آرزو کا اظہار گونا گوں لطیف استعاروں سے کرتا ہوا کہتا ہے :

جانم ملول گشت ز فرعون و ظلم او
ان نور روی موسیٰ عمرانم آرزوست

زین همرهانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستم دستانم آرزوست

رومی جیسا کہ اپنے آئینۂ کلام میں نظر آتا ہے اپنے مردہ و افسردہ ماحول کے خلاف ایک شدید ردِ عمل تھا ۔ وہ جہاں تمام عالم انسانی کو صلح و محبت کا پیغام دے رہا تھا وہاں مسلمانوں کو کفار کے خلاف جو ملتِ واحدہ کی صورت میں اسلام کے مٹانے کے درپے تھے جہاد پر اکسا رہا تھا ۔ تاتاریوں کی وحشی گری

کے خلاف اقدام کے لئے مسلمانوں کو تحریک کرتا ہوا کہتا ہے کہ وہ ان کے خلاف لڑیں اور ہرگز مایوس نہ ہوں :

تتار اگرچہ جہان را خراب کرد بجنگ
خراب گنج تو دارد چرا شود دل تنگ[۸]

رومی میں اگر اس مجاہدانہ روح اور مبارزانہ عمل کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی رگوں میں اس کے عظیم اجداد معنوی کا خون موجزن تھا ۔ شیخ نجم الدین کبریٰ جیسی عظیم شخصیت سے اسے خاص نسبت تھی ۔ وہ رومی کے والد بزرگوار سلطان العلماء شیخ بہاء الدین ولد کے بھی مرشد تھے اور شمس الدین تبریزی کے پیر بابا کمال جندی کے بھی مرشد تھے ۔ شیخ نجم الدین کبریٰ ان بزرگوں کے علاوہ شیخ فرید الدین عطار نیشا پوری ، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی جیسے بلند پایہ اولیاء کے بھی رہبر و رہنما تھے ۔[۹]

۱۲۱۸ء میں تاتاریوں کے حملہ جرجانیہ (خوارزم) کے دوران آپ نے بڑی داد شجاعت دی ۔ آپ نے اس وقت اپنے اصحاب سے فرمایا :

"قوموا علیٰ اسم اللہ فقاتلوا فی سبیل اللہ" خرقہ بدن سے اتارا اور شمشیر بکف ہو کر تاتاریوں پر جھپٹے اور ایک کافر کے ہاتھ سے چنگیزی لشکر کا پرچم چھین لیا ، پھر اسی دوران لڑائی میں شہید ہو گئے ۔"[۱۰]

گویا آپ اس حدیث کی تفسیر تھے کہ "لی خرقتان ، الفقر و الجہاد" ۔ یعنی میرے دو خرقے ہیں ایک فقر اور ایک جہاد ۔

رومی کے ذہن پر نجم الدین کبریٰ کے اس بلند عزم و ہمت کا نقش نمایاں دکھائی دیتا ہے ۔ مثلاً ان اشعار میں :

ما ازان محتشمانیم کہ ساغر گیرند و نہ زان مفلسکاں کہ بر لاغر گیرند
ما ازان سوختگانیم کہ از لذت سوز آب حیوان بہلند و پی آذر گیرند

بیکی دست می خالص ایمان نوشند بیکی دست دگر پرچم کافر گیرند[11]

یعنی ہم ان عظیم ہمت افراد سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک ہاتھ سے جام شہادت نوش کرتے ہیں اور دوسرے سے کفار کے پرچم چھین لیتے ہیں -

دینی تعلیمات اور بزرگوں کے ان واقعات نے رومی کی روح کو جہاں جہاد سے سرشار کر رکھا تھا وہاں فتح و امید کی نوید بھی دے رکھی تھی - ۶۵۹ھ میں جب مصر کے سپہ سالار بیبرس نے منگولوں کو شکست دی اور ان کی پیش قدمی رک گئی تو اس سے روم کے عیسائیوں کے عزائم بھی شکست پذیر ہوئے - رومی نے اسے مسلمانوں کی کامیابی تصور کرتے ہوئے کہا :

زنار گسستیم بر قیصر رومی تبریز بر قصہ کہ در روم رسیدیم[12]

رومی کے ہاں اگرچہ اقدامی جہاد کے بھی اشارات ملتے ہیں مگر دفاعی جہاد کے لئے وہ مسلمانوں کو مسلسل تعلیم دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جب دشمن تمہارے ساتھ لڑتا ہے تو تم بھی اس کے ساتھ لڑو - کتا جب تنگ کرے تو اسے پتھر مارنا ہی پڑتا ہے :

حریف جنگ گزیند ، توھم درآ در جنگ
چو سگ صداع دھد ، تن مزن بر آور سنگ[13]

حیات ملی کا تقاضا ہے کہ اسے قوت اور شوکت سے بسر کیا جائے - غنچے کی طرح نرم و نازک اور دانے کی طرح کمزور اور حقیر بن کر زندگی بسر نہیں کی جا سکتی - زندگی اس دامگاہ حوادث میں اپنے دفاع کی محتاج ہے :

غنچہ باشی کود کانت بر کنند دانہ باشی مرغکانت بر چنند
غنچہ پنہاں کن گیاہ بام شو دانہ پنہاں کن سراپا دام شو

مسلمانوں کے اس سیاسی اور اخلاق دور انحطاط میں فلاسفہ اور متکلمین کی متفکرانہ بحثیں بھی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھیں - ایک مرکزی مسئلہ یہ تھا کہ آیا

صفات الٰہی عین ذات ہیں یا غیر ذات ؟ اور کائنات کیا ہے ؟ اور اس کا صدور آیا قوت خداوندی سے بے اختیار واقع ہوا ہے ؟ اس دور کی ایک اہم شخصیت یعنی ابن العربی کے نزدیک صدور کائنات حق تعالیٰ سے بے اختیار ہوا ہے ۔ اس کا کوئی آغاز اور انجام نہیں ۔ یہ مسلک تمام فلاسفہ اور بعض صوفیہ کا ہے ۔ لیکن اس کے برعکس تمام متکلمین اور اکثر صوفیہ اس مسلک کے حامل ہیں کہ کائنات صفات الٰہی ہے جو بالاختیار اور بالارادہ الٰہی معرض وجود میں آئی ہے ۔ اس کا آغاز ہے اور انجام ہے ۔

اپنشدون کی رو سے یہ کائنات خدا سے اس طرح صادر ہوئی ہے جس طرح شعاعیں آفتاب سے صادر ہوتی ہیں ۔ اور جس طرح آگ سے چنگاریاں نکلتی ہیں اسی طرح خدا سے ارواح کا صدور ہوتا ہے اور انجام کار یہ ارواح اسی کی طرف لوٹ جاتی ہیں ۔ خدا کے سوا کوئی شے موجود نہیں ۔ یہ کائنات اس کا خیال ہے ۔

فلاسفہ منجملہ فلاطینوس کا نظریہ یہ ہے کہ عقل کل یا علت اولیٰ کا پیمانہ چھلکا اور اس سے تمام کائنات وجود میں آئی ۔ تخلیق کا یہ نظام بے ارادہ ہمیشہ جاری و ساری رہے گا ۔

اسلام میں فلسفہ بالخصوص معتزلہ کے توسط سے پیدا ہوا ۔ مسلمانوں پر فلسفہ کے اثرات کچھ خطرناک صورت اختیار کرنے لگے ۔ ابوالحسن الاشعری چوتھی صدی ہجری کا معروف معتزلی ہے جو معتزلہ کے عقائد سے منحرف ہو کر امام شافعی کے عقائد میں داخل ہوا ۔ اس نے اسلام پر فلسفہ کے اثرات کو زائل کرنے اور اسلامی علم کلام کو مدون کرنے کی باقاعدہ اور کامیاب کوشش کی جس سے معتزلہ فلاسفہ قدرے رکے ۔ اس دور میں دوسری شخصیت جو ابھری وہ ابو منصور ماتریدی سمرقندی کی تھی ۔ یہ اسلامی نقطۂ نظر میں زیادہ کٹر تھا اور فلسفہ کے اساسی عقائد جو ابوالحسن الاشعری کی کوشش سے باطل نہیں ہوئے تھے ، اس نے فلسفیانہ بنیادوں پر ان کی باقاعدہ تردید کی ۔

تیسری عظیم شخصیت جس نے قواعدِ دین سے یونانی فلسفے کو بالکل نکال باہر کیا اور علم عقائد ، علمِ عبادات اور علم قربِ الٰہی قرآن و سنت سے باقاعدہ استنباط کر کے تفصیلی طور پر علم کلام مرتب کیا ، وہ امام محمد غزالی (م ۵۰۵) تھا ۔ اس نے مذہب کی جڑیں خاص و عام کے دل میں راسخ کر دیں اور یونانی فلسفے کی عمارت کو اسلامی فکر کامل کے سامنے یکسر منہدم کر دیا ۔ غزالی کے عقیدے کے کے مطابق انسان اور کائنات خدا کی صفت بالاختیار ہے جس کے پیچھے ایک عظیم مقصد کارفرما ہے ۔ اس تخلیق کا ایک آغاز ہے اور ایک انجام ۔ غزالی نے جہاں خدا کے بارے میں وہ روشن اور واضح شعور پیش کیا جو اسلام میں تصورِ توحید کے نام سے پہچانا جاتا ہے وہاں انسان کے بارے میں خلافت الٰہیہ کا صحیح فکر دے کر انسانی عظمت کو پوری طرح اجاگر کیا ۔ کائنات کے بارے میں غزالی کا خیال یہ ہے کہ یہ انسان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے تاکہ انسان خدا کے مقاصد کو یہاں پورا کرے ۔ امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر اگرچہ علم کلام کا ایک عظیم کارنامہ تھا لیکن فخر الدین رازی بیشتر فلسفہ کی زد میں آ گیا اور اسلام کے لئے اس سے خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا ۔ چنانچہ رومی نے کہا :

گر بہ استدلال کار دین بدی فخر رازی رازدار دین بدی
پای استدلالیان چوبین بود پای چوبین سخت بی تمکین بود[۱۶]

رومی کے کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی مفکرین میں سے کسی بھی دوسرے مفکر کی نسبت امام غزالی سے زیادہ قریب ہے[۱۷] ۔ ابن العربی اور رومی میں بعض جہات سے کچھ مماثل خطوط مل سکتے ہیں لیکن بنیادی نظریۂ وحدت الوجود میں دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ ابن العربی وحدت الوجود کا انتھک مفسر ہے جبکہ رومی انسان کی شخصی بقا اور اس کے ارتقا کا بلند پایہ مبلغ ہے ۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا وہ مسلمانوں کے زوال پذیر ماحول میں احیائے اسلامی کی کوشش میں مصروف تھا اور اسلامی تشخص کی برقراری پر زیادہ سے زیادہ زور دے رہا تھا ۔ وحدت الوجود کا مسئلہ بالکل برعکس نتائج کا

حامل تھا ۔ یہ گویا صلح کل کا راستہ تھا جسے ابن العربی نے اختیار کیا ۔ اس کی رو سے اسلام وکفر اور خیر و شر میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا ۔ مسلمان ، عیسائی ، یہودی ، مجوسی اور کافر سب ایک ہی لڑی کے موتی بن جاتے ہیں ۔

وحدت الوجود کا نظریہ یہ ہے کہ خدا کے سوا اور کسی چیز کا وجود نہیں ، جو کچھ ہے وہ خدا ہی کی ذات کا مظہر ہے ۔ ہستی ایک ہی ہے اور وہ تمام مختلف ہستیوں میں موجود اور کائنات کی ہر چیز میں جاری و ساری ہے ۔ وہ ہستی خدا ہے ۔ اس نظریے کے نتیجے میں بعض متصوفین نے کلمۂ توحید لا الہ الا اللہ کو کلمۂ وحدت یعنی لا موجود الا اللہ سے تعبیر کرنا شروع کیا ۔ کلمۂ توحید یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں جبکہ وحدت الوجودیوں نے کہا کہ خدا کے سوا کوئی موجود ہی نہیں ۔ اس طرح انفرادی خودی ، ملی تشخص اور حتٰی کہ کائنات کی نفی کر دی ۔ ان کے نزدیک جو کچھ نظر آتا ہے وہ نمود بے بود ہے ۔ مختلف اشیا کا وجود محض اضافی اور نظری ہے ۔ یہ سمندر میں موجوں کے وجود کی طرح ہے جو بظاہر ہے لیکن فی الواقع نہیں ہے کیوں کہ درحقیقت موج پانی ہی ہے یا کسی دھاگے میں مختلف گرہوں کا وجود ۔ یہ بھی محض فریب نظر ہے کیوں کہ اگر گرہوں کو کھول دیا جائے تو وہ محض دھاگہ ہی ہے ۔ اس طرح تمام اشیاء کی ہستی محض اضافی اور فریب نظر ہے اور عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے ۔

وحدت الوجود کے ان نظریات کو رومی نہ صرف قبول نہیں کرتا بلکہ ان کی تردید پر کمربستہ ہے ۔ کیوں کہ وہ انسانی خودی کی بقا اور ارتقا کو ہر دوسری بات سے ضروری گردانتا ہے ۔ وہ انسانی ذات کی نامحدود وسعتوں اور اس کی بے پایاں صلاحیتوں کو اس شدت اور اس اعتبار سے بیان کرتا ہے کہ گویا یہ ایک فریضہ ہے جو اسے سونپا گیا ہے ۔ رومی نفی ذات کے ان تمام نظریات کی تردید اور تنسیخ پر تُلا ہوا نظر آتا ہے جن کے نتیجے میں ملت اسلامیہ فکری انتشار کا شکار ہو کر اپنا پر شکوہ تشخص اور وقار کھو بیٹھی ۔ اس کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ وہ انسان کو خدا کے قریب تر کرے اور انسان کو خدا کا عاشق قرار دے تا کہ وہ

خدا کو اپنے اندر جذب کر سکے - اس کے نزدیک معشوق عاشق کا شکار ہوتا ہے - چنانچہ کہتا ہے :

"جملہ معشوقاں شکار عاشقاں"

وہ ابن العربی اور دیگر صوفیہ کی طرح انسان کو خدا میں گم نہیں کرتا بلکہ وہ خدا کو انسان میں گم کرتا ہے یہی اس کا تصور عشق ہے - چنانچہ کہتا ہے :

علم حق در علم صوفی گم شود
ایں سخن کی باور مردم شود

ان مطالب کی روشنی میں رومی کو ابن العربی کی طرح وحدت الوجودی تصور کرنا نا انصافی ہے - رومی اسلامی فکر کی تاریخ میں حرکت ، ارتقا اور روشنی کا سب سے بڑا مبلغ ہے - اسی وجہ سے عصرِ حاضر میں حکیم الامت علامہ اقبال نے احیائے ملی کے لیے سب سے زیادہ رومی کی طرف توجہ دی اور اس کے مکتبِ فکر و نظر سے بھرپور استفادہ کیا - اسے شریک مستیٔ خاصان بدر کہتے ہوئے اپنا پیر و مرشد قرار دیا اور کہا

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی

اقبال جو کہ وحدت الوجود کے اثرات کو تباہی بغداد سے زیادہ خطرناک سمجھتا تھا کیسے ممکن تھا کہ ایک وحدت الوجودی کے آستانے پر سر رکھ دیتا - وہ اپنے ایک خط میں خواجہ حسن نظامی کو کہتے ہیں .

"میں نے مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی کو بیداری میں پڑھا ہے اور بار بار پڑھا ہے - آپ نے شاید اسے سکر کی حالت میں پڑھا ہے کہ آپ کو اس میں وحدت الوجود نظر آتا ہے[١٨] -

نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حدیث "تخلقوا باخلاق اللہ" کے

مطابق رومی کا عقیدہ ہے کہ انسان اپنی خودی یا فردیت کو فنا کئے بغیر صفاتِ خداوندی کو اپنی ذات میں جذب کر سکتا ہے ۔ اکثر صوفیہ کی تعلیم یہ ہے کہ جس طرح قطرہ دریا میں فنا ہو کر دریا بن جاتا ہے اسی طرح انسان کو بھی چاہیے کہ وہ خدا میں فنا ہو جائے کیونکہ فنا ہی آئینۂ بقا ہے ۔ رومی اس کے برعکس یہ تعلیم دیتا ہے کہ جس طرح لوہا جو سیاہ اور سرد ہے آگ میں جا کر روشن اور گرم ہو جاتا ہے اور مکمل طور پر آگ کا ہم رنگ اور ہم صفت بن جاتا ہے لیکن اپنے وجود کو برقرار رکھتا ہے اسی طرح انسان کو چاہیے کہ وہ اوصافِ الٰہی سے متصف ہو مگر اپنی فردیت کو ضائع نہ کرے ۔

رنگ آهن محو رنگ آتش است
ز آتشی می لافد و آهن وش است[۱۹]

رومی اس مقام کی توضیح میں ایک اور روشن مثال پیش کرتا ہوا کہتا ہے کہ شمع کی لو سورج کی روشنی کے سامنے بظاہر نہیں ہے لیکن فی الواقع وہ ہے کیونکہ جب تم اس پر روئی رکھو گے تو وہ جل جائے گی ۔

چون زبانہ شمع پیش آفتاب نیست باشد ، هست باشد در حساب
هست باشد ذات او تا تو اگر بر نهی پنبه بسوزد آن شرر[۲۰]

شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ " بقا میں سالک کی حالت جلال اور عظمت سے لبریز ہوتی ہے ۔ مولانا پر یہ حالت زیادہ غالب رہتی تھی ۔ اس لئے ان کے کلام میں جو جلال ، ادعا ، بے باکی اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے وہ صوفیہ میں سے کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی ۔ مرزا غالب مولانا کے ایک شعر پر جو بقا کی حالت ہے سر دھنا کرتے تھے ۔ وہ شعر یہ ہے

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند
فرشته صید و پیمبر شکار و یزداں گیر[۲۱]

یعنی خدا کی کبریائی کے محل تلے کچھ جواں ہمت افراد کھڑے ہیں جو فرشتوں کے

صیاد ہیں - پیغمبروں کو گرفت میں لاتے ہیں اور خدا پر کمندیں ڈالتے ہیں - رومی کا بیشتر کلام خود آگاہی کے مضامین کا ایک سمندر ہے ، خصوصاً دیوان شمس تبریزی جہاں رومی کی متلاطم اور متّواج طبیعت ایک طوفان برپا کئے ہوئے ہے - مثلاً یہ ایک شعر .

خود ز فلک برتریم و ز ملک افزوں تریم
زین دو چرا نگذریم ، منزل ما کبریاست[۲۲]

علامہ اقبال نے اس شعر سے جو تاثر لیا اور جس طرح خراج تحسین ادا کیا وہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے .

شعلۂ در گیر زد در خس و خاشاک من
مرشد رومی کہ گفت . منزل ما کبریاست"

رومی کوشش ، جد و جہد اور سوز و ساز کا شاعر ہے - اس نے اپنی خالص قرآنی بصیرت کی بناء پر وحدت الوجود اور دیگر مبہم اور غلط نظریات اور ان کے نتائج کو درک کیا اور مسلمانوں کے احیا اور بقا کے لیے ان کے انفرادی اور اجتماعی تشخص کو ضروری قرار دیا - اس نے ہر اس سیاسی اور فکری تحریک کی سختی سے مخالفت کی جو مسلمانوں کے وجود کو نابود یا ضعیف کر سکتی تھی - اس نے خالصۃً قرآنی نظریۂ حیات کو پیش کیا جس کی بنیاد عمل پر ہے اور جس نے انسان کی لوح تقدیر پر "لیس للانسان الا ما سعیٰ" کی روشن آیت مرقوم کی -

رومی سعی و عمل کی شدت سے تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ کوشش و کار کی ہر صورت کو خواہ وہ بیہودہ ہی کیوں نہ ہو بے عملی سے بہتر سمجھتا ہے -

دوست دارد دوست این آشفتگی
کوشش بیہودہ بہ از خفتگی[۲۳]

وہ عقیدہ جبر کا سختی سے مخالف ہے جو وحدت الوجود کا لازمہ ہے - اس نے

بیکاری بے عملی اور سستی کی اپنے کلام میں جابجا مذمت کی ہے اور توکل یا جبر یا تسلیم کا بہانہ بنا کر عملی زندگی سے گریز کرنے والوں پر سخت اعتراض کیا ہے اور ان کے بہانوں کو باطل قرار دے کر کہا ہے .

پای داری چون کنی خود را تو لنگ دست داری چون کنی پنهان تو چنگ

خواجه چون بیلی بدست بنده داد بی زبان معلوم شد او را مراد

یعنی تمہارے پاؤں سالم ہیں اپنے آپ کو لنگڑا کیوں بنا ہو رہے ، تمہارے ہاتھ ہیں انہیں کیوں چھپا رہے ہو ؟ جب کوئی مالک اپنے نوکر کو بیلچہ دیتا ہے تو بغیر کہے ہی اس کا مطلب واضح ہوتا ہے یعنی یہ دو بازو کیا ہیں اور کس لئے ہیں ؟

رومی اپنے مریدوں سے کہا کرتا تھا ''کسی کہ کاری تورزد پولی نیرزد'' بروید و کار کنید ۔ اس کے نزدیک سعی و عمل سے انسان لامتناہی قوتوں اور عظمتوں کا حامل بن سکتا ہے اور خدا کے ترازو میں پورا اتر سکتا ہے ۔

ذره ای گر جهد تو افزون شود در ترازوی خدا موزون شود

رومی جو کہ قائل تھا کہ . ''کار مردان روشنی و گرمی است'' ۔ گوشہ گیری اور خلوت نشینی کی کسی صورت کو پسند نہیں کرتا تھا ۔ ایک دفعہ جب خود مولانا کے بیٹے سلطان ولد نے بیس سال کی عمر میں مولانا سے خلوت نشینی کی اجازت چاہی تو اسے اس ارادے سے منع فرمایا اور اس امر کو مسلمانوں میں بدعت قرار دیتے ہوئے کہا ۔

'' محمدیان را خلوت و چهله نیست و در دین ما بدعت است اما در شریعت موسیٰ و عیسیٰ علیهم السلام بوده است ۔''[۲۴]

رومی کو دنیا میں مسلمانوں کی عظمت اور شوکت مطلوب تھی اور وہ جانتا تھا کہ اسلام کا یہی مزاج ہے ۔ گوشہ گیری نفیٔ خودی اور سربریزی اسلام میں رہبانیت کے نتیجے ہیں ۔ اسلام جہاد اور شکوہ و جلال کا متقاضی ہے تاکہ ایک اعلیٰ اور آفاقی معاشرہ تشکیل دیا جا سکے ۔ فرماتا ہے :

مصلحت در دین ما جنگ و شکوه مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوه[۲۵]

رومی مثنوی میں پیغمبر علیہ السلام کو ''نبی السیف'' کا نام دیتا ہے اور آپ کے اُمتیوں کو صفدر یعنی صفوں کو چیرنے والے کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ چونکہ بعض مسلمانوں میں مرور زمان کے ساتھ ساتھ مسیحی رحجانات بھی پیدا ہو چکے تھے اور انہوں نے خانقاہی نظام اختیار کر لیا تھا اور یہ کیفیت سیاسی انحطاط کی وجہ ہے اس کے دور میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی لہٰذا اس نے اس کے خلاف زبردست آواز اٹھائی اور کہا۔

از ترهب نهی کردست آن رسول بدعتی چون در گرفتی ای فضول ؟

درمیان امت مرحوم باش سنت احمد مهل، محکوم باش

چون نبی سیف بودست آن رسول امت او صفدرانند و فحول[۲۶]

مولانا کے نزدیک زندگی کے معرکے خواہ جسمانی ہوں خواہ روحانی صرف اور صرف قوت سے سر ہو سکتے ہیں ، اور سست عناصر اور نازک طبع انسانوں کے بس کا روگ نہیں۔

این جهاد اکبر است آن اصغر است هر دو کار رستم است و حیدر است[۲۷]

یعنی جہاد کے لئے بودے ، کمزور اور خانقاہ نشین افراد نہیں بلکہ علی مرتضیٰ اور رستم جیسے دلیر اور بہادر انسانوں کی ضرورت ہے۔ رومی نے مثنوی میں ایک صوفی کا مذاق اڑایا ہے جسے جہاد کا شوق ہو گیا تھا مگر وہ ایک اسیر کو بھی قتل کرنے کی تاب نہ لا سکا۔ چنانچہ ایسے مجاہدین کی زبان سے کہا کہ کسی خانقاہ کے مطبخ میں کام کر ، جنگ تیرے بس کی بات نہیں۔

کار هر نازک دمی نبود قتال

که گریزد از خیالی چون خیال[۲۸]

جنگ میں اگر مجاہدین کو کبھی شکست ہوتی ہے تو رومی کے نزدیک اس کی

وجہ بھی چند سست اور مخنث ہوتے ہیں ۔

هر کجا لشکر شکسته می رود
از دو سه سست و مخنث می شود[29]

جہاد پر رومی نے مثنوی میں بھرپور لکھا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں اس کے نزدیک وسائل جنگ بھی ضروری ہیں لیکن ان سے بڑھ کر عزم و ہمت اور قوت و شجاعت کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ کہتا ہے صرف ذوالفقار سے بات نہیں بنے گی شیر خدا کا بازو درکار ہے ۔

چون که مردی نیست خنجرها چه سود
چون نباشد دل ندارد سود خود

از علی میراث داری ذوالفقار
بازوی شیر خدا هستت بیار[30]

مولانا کی شخصیت کا عرفان اگرچہ مشکل اور بہت مشکل ہے لیکن جو بھی تھوڑی بہت کوشش کی جائے اس میں ضروری ہے کہ مولانا کی دلیر اور مبارز روح کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے اور اسی نقطہ نظر سے اس کے کلام کا مطالعہ کیا جائے ۔ وہ بہت ہی غیر معمولی قوتوں کا حامل تھا ۔ اس کی خودی کا یہ عالم تھا کہ بد ترین حالات میں بھی اس کے پائے آہنین میں کبھی لغزش نہ آئی ۔ جیسا کہ کہتا ہے ۔

چه دانی تو که در باطن چه شاهی همنشین دارم
رخ زرین من منگر که پای آهنین دارم[31]

اس کے مکتب میں پائے آہنیں کے ساتھ دست آہنیں کا تصور بھی قابل ملاحظہ ہے ۔

خدایا مطربان را انگبیں ده
برای ضرب دست آهنیں ده[32]

جو شخص بزم میں مطرب کے لئے دست آہنین کا طالب ہے وہ رزم میں مجاہد کے لئے کس قوت اور کس پختگی کا خواہاں ہوگا ۔ رومی ہمیشہ غلبہ و تسخیر اور استیلا و چیرہ دستی کی تعلیم دیتا ہے ۔ عرصۂ حیات میں اپنی شیرانہ صفات کا اظہار کرتا ہوا کہتا ہے ۔

دیدۂ سیر است مرا جان دلیر است مرا
زہرۂ شیر است مرا زہرۂ تابندہ شدم[۳۳]

اقبال اپنے کلام میں جگہ جگہ رومی کے اسی پر جلال اور تابناک چہرے کو پیش کرتا ہے اور اس کا تعارف ایک عظیم مبارز اور فعال انسان کی حیثیت سے کراتا ہوا کہتا ہے کہ رومی ایسا غزال حرم ہے جس کے تیور شیروں جیسے ہیں :

غزالی در بیابان حرم بین   کہ ریزد خندۂ شیر از لب او[۳۴]

رومی انفرادی اور اجتماعی خودی کا انتھک مفسر، شریعت کا زبردست مبلغ، طریقت کا عظیم شارح اور حقیقت کا بزرگ عارف ہے ۔ اس کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے غیر اسلامی تصوف اور بے معنی مسائل کو دینی تعلیمات سے خارج کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اسلامی معارف کو اپنے بہترین اسلوب بیان سے لوگوں کے ذہن نشین کیا ۔ شریعت اور طریقت کے غیر حقیقی فاصلوں کو یکسر ختم کیا ۔ اس نے ایک طرف اہل شریعت کے لئے احکام الٰہی کی تصدیق بواسطۂ قلب ضروری قرار دی اور دوسری طرف اہل طریقت پر روشن کیا کہ تصوف شریعت ہی کا نام ہے ۔ سالک خواہ کسی بھی مقام پر یا کسی بھی حال میں ہو اس کے لئے احکام شرعی سر مو بھی ساقط نہیں ہو سکتے ۔

مگسل از ختم الرسل ایام خویش
تکیہ کم کن بر فن و بر گام خویش

اسی بنا پر مثنوی معنوی کو فارسی زبان میں قرآن سے تعبیر کیا گیا ہے ۔

مثنوی معنوی مولوی   ہست قرآن در زبان پہلوی

من چہ گویم وصف آن عالیجناب ❊ نیست پیغمبر ولی دارد کتاب

ادب ہمیشہ اقوام کی تعمیر و تخریب میں نہایت مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب یہ بھی بنا کہ ان کی توجہ عموماً ادب کے نازک اور لطیف مضامین پر مرکوز رہی اور جہاں بھی سخت کوشی اور مبارزہ طلبی کا سبق دیا گیا انہوں نے عموماً اسے نظر انداز کیا یا اس سے کوئی معنوی مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ساتویں صدی ہجری میں احیائے اسلامی کی مؤثر اور زبردست تحریک بلا مبالغہ ہمیں رومی کی مثنوی میں ملتی ہے لیکن بدقسمتی سے اس کی مثنوی کی عموماً تفسیریں اور شرحیں تصوف کے روایتی انداز میں کی گئیں اور اسے محض افراد کی روحانی تربیت کے لئے پڑھا گیا۔ علامہ اقبال نے اسی وجہ سے رومی کے متعلق کہا تھا:

شرح اوش کردند و او را کس ندید
معنی او چون غزال از ما رمید[36]

یعنی اس کی شرحیں تو لوگوں نے کیں لیکن اسے کوئی نہ پہچان سکا اور اس کے معانی ہماری گرفت میں نہ آسکے۔ فخر الدین عراقی نے بھی جو مولانا کا معاصر صوفی شاعر تھا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

"او را کما ینبغی ہیچ کس نشناخت، او در عالم غریب آمد و غریب رفت"[37]

یعنی اسے کماحقہ کسی نے نہ پہچانا وہ دنیا میں اجنبی آیا اور اجنبی ہی چلا گیا۔ رومی نے خود بھی اپنے متعلق یہی کہا تھا۔

ہر کسی از ظن خود شد یار من
وز درون من نجست اسرار من[38]

حوالہ جات

۱- ملفوظات رومی ، ص ۱۲۹ -

۲- تاریخ ادبیات در ایران ، دکتر صفا ، جلد سوم ، تہران ، ص ۱۱۰ -

۳- ایضاً ، ص ۱۱۵ -

۴- فیہ مافیہ ، ص ۲۸ -

۵- دیوان شمس تبریزی ، جزو چہارم ، تہران ۱۳۳۹ ، ص ۲۷۰ -

۶- فیہ مافیہ بہ تصحیح فروزانفر ، تہران ۱۳۵۸ ، ص ۵ -

۷- کلیاتِ شمس ، جزو اول ، تہران ، ص ۲۵۵ -

۸- کلیات شمس ، جزو سوم ، تہران ۱۳۳۸ شمسی ، ص ۱۴۲ -

۹- نجم الدین کبریٰ ، منوچہر محسنی ، تہران ۱۳۴۶ ، ص ۷۶ -

۱۰- ایضاً ، ص ۲۱-۲۲ -

۱۱- کلیات شمس ، جزو دوم ، تہران ۱۳۳۷ شمسی ، ص ۱۳۹ -

۱۲- کلیات شمس ، جزو سوم ، تہران ۱۳۳۸ شمسی ، ص ۲۲۸ -

۱۳- ایضاً ، ص ۱۴۳ -

۱۴- تاریخ تصوف ، یوسف سلیم چشتی ، لاہور ، ص ۲۳ -

۱۵- ایضاً ، ص ۲۶ -

۱۶- مثنوی چاپ علمی ، تہران ، ۱۳۲ ، جلد اول ، ص ۵۶ -

۱۷- ایضاً -

۱۸- مقالات اقبال ، سید عبدالواحد معینی ، لاہور ، ۱۹۶۳ء ، ص ۱۸۰ -

۱۹- مثنوی معنوی چاپ علمی تہران ۱۳۲۰ جلد سوم ، ص ۲۹۰ -

۲۰- ایضاً ، ص ۲۹۰ -

۲۱- شبلی نعمانی ، سوانح مولانا روم ، لاہور ، ص ۷۱-۷۲ -

۲۲- کلیات شمس ، جزو اول ، تہران ۱۳۴۴ شمسی ، ص ۲۷۰ -

۲۳- مثنوی معنوی ، چاپ علمی تہران ۱۳۲۰ ، جلد اول ، ص ۴۸ -

۲۴- زندگانی مولانا جلال الدین ، ص ۱۲۵ -

۲۵- مثنوی ، چاپ علمی ، تہران ۱۳۲۰ ، جلد ششم ، ص ۵۶۲ -

۲۶- ایضاً ، ص ۵۶۲ -

۲۷- ایضاً ، جلد پنجم ، ص ۵۳۶ -

۲۸- مثنوی معنوی ، چاپ علمی ۱۳۲۰ تهران ، جلد پنجم ، ص ۵۳۵ -
۲۹- ایضاً ، جلد دوم ، ص ۱۶۸ -
۳۰- ایضاً ، جلد پنجم ، ص ۴۹۹ -
۳۱- کلیات شمس ، جزو سوم ، تهران ۱۳۳۸ شمسی ، ص ۱۹۸ -
۳۲- ایضاً ، جزو پنجم ، تهران ۱۳۳۹ شمسی ، ص ۱۳۵ -
۳۳- ایضاً ، جزو سوم ، تهران ۱۳۳۸ شمسی ، ص ۱۸۰ -
۳۴- ارمغان حجاز -
۳۵- مثنوی چاپ علمی ، تهران ۱۳۲۰ ، جلد چهارم ، ص ۳۳۸ -
۳۶- جاوید نامه ، ص ۲۴۵ -
۳۷- زندگانی مولانا جلال الدین ، ص ۱۲۵ -
۳۸- مثنوی ، ص ۱ -